گوشۂ ادب رثائی

خلاق مضامین نواب مولانا سید مہدی حسین نقوی ماہرؔ اجتہادی

لسان الہند مولانا مرزا محمد ہادی عزیزؔ لکھنوی

نواب مولوی سید مہدی حسین ابن سید علی حسین ابن سید العلماء مولانا سید حسین ابن غفران مآب مولانا سید دلدار علی نصیرآبادی لکھنؤ کے باکمال اور نازک خیال شعراء میں تھے۔ ان کی خاندانی بزرگی ثابت کرنے کو یہی کافی ہے کہ غفران مآب کے پوتے تھے۔ کرۂ اسلام پر جس کا مقدس نام آفتاب کی طرح اپنی روشنی ڈال رہا ہے۔ شیعی دنیا اس بات پر متفق ہے کہ بارہویں صدی میں ہندوستان کی سرزمین پر پہلا شخص ہے جس نے دین کی بنیادوں کو مستحکم کیا۔ لکھنؤ کی ابتدائی حالت لوگوں کی نگاہ میں ہے۔ آصف الدولہ کا دور شراب اور بھنگ کا عروج اور ضروریات دین کی بے خبری جاننے والے جانتے ہیں۔ تاریخی صفحات پر بھی غالباً واقعات درج ہوں۔ میں مرنے والوں کی روحوں کو شرمندہ کرنا نہیں چاہتا۔ خدا ان کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے۔ اس قلعۂ بدعت کے نیست ونابود کرنے کا سہرا غفران مآب کے سر رہا۔ آصف الدولہ کی روح میں الٰہیات کا جلوہ پیدا کرنے والا یہی شخص ہے۔ تحصیل علوم کے بعد جب ایران سے ہندوستان آئے تو آصف الدولہ کے دربار میں پہنچے۔ یہاں کے حالات پر نظر کرکے برابر اپنے مواعظ میں نواہی کی مذمت کی اور اوامر کی طرف توجہ دلائی۔ ان مجالس وعظ میں خود آصف الدولہ بھی شریک ہوتے تھے۔ شاہ مرحوم جہاں سخاوت وعدالت میں یکتائے روزگار ہوئے، وہاں اور عقائد میں بھی ایک بزرگ کی بدولت شہرۂ آفاق ہوئے۔ غفران مآب نے اپنی سوانح اور خاندانی تاریخ میں خود لکھا ہے، جس کا نام ''آئینۂ حق نما'' ہے۔

یہ واقعات طول چاہتے ہیں اگر میں اپنی معلومات کے موافق بھی لکھوں تو ایک مستقل تصنیف ہو جائے گی۔ صرف جناب ماہرؔ کے اعزاز خاندانی کے ثابت کرنے کو چند سطریں لکھی گئیں۔ دنیاوی عزتیں جوان کو ملیں وہ اس شرف کے مقابل میں قابل الذکر نہیں۔

سال ولادت اور ابتدائی زمانہ

۱۳۲۵ھ اکسٹھ سال کی عمر میں ماہرؔ کا چراغ زندگی خاموش ہوا۔ اس حساب سے ۱۲۶۴ھ میں ان کی ولادت معلوم ہوتی ہے۔ لکھنؤ مسقط الراس ہے۔ نو مہینے کی عمر میں باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ اپنے جد امجد سید العلماء کی آغوش تربیت میں پرورش پائی۔ یہی وہ مدرسہ تھا جہاں انھوں نے اخلاقی سبق حاصل کیا۔ مگر زمانہ نے بہت کم موقع دیا۔ ہنوز ۹ رسال کی عمر بھی نہ ہوئی تھی کہ سید العلماء نے سفر آخرت اختیار کیا اور اس کے بعد ماہرؔ اپنے بڑے بھائی سید باقر حسین صاحب کی زیر تربیت رہے۔ اور انھیں سے تعلیم پائی۔ تعلیم کے حالات مجھ کو مفصل معلوم نہیں کہ استعداد علمی کہاں تک تھی اور کتب درسیہ نظامیہ کو کس سے پڑھا لیکن یہ ضرور ہے کہ ان کے کلام سے باسواد ہونے کا اندازہ ملتا ہے۔

تاہل

گیارہ سال کی عمر میں سید محمد تقی صاحب (ممتاز العلماء فرقۂ شیعہ کے جید مجتہد) کی کوشش سے تاج محل مرحومہ (زوجۂ نصیرالدین حیدر بادشاہ اودھ) کی چھوٹی لڑکی سے منسوب ہوئے۔ تاج محل کی صاحبزادی سے عقد جناب ماہرؔ کی زندگی کا ایک نمایاں واقعہ ہے۔ جس سے دنیوی اعزاز اور لباس فاخرہ ان کے زیب بدن ہوا۔ تفصیلی حالات کا قلم انداز کرکے مجمل حالات

حوالۂ قلم ہیں۔

جناب ماہرؔ نے اس نسبت کے زمانہ میں تاج محل کے ساتھ کربلا کا سفر کیا۔ ان کے ساتھ ان منجھلے بھائی سید جعفر حسین صاحب بھی تھے۔ یہ غدر کے بعد کا واقعہ ہے۔ عرصۂ دراز تک سرزمین کربلا پر قیام پذیر رہے۔ اسی زمانہ میں سید جعفر حسین صاحب کی شادی تاج محل کی بڑی صاحبزادی سے ہوئی۔ ان سے ایک لڑکی پیدا ہوئی جس کے نو مہینے بعد سید جعفر حسین کا انتقال ہوگیا۔ (اس واقعہ کو ناظرین ملحوظ رکھیں) گردش فلکی دیکھو کہ حضرت ماہرؔ کی زوجہ نے بھی تھوڑے زمانے کے بعد رحلت کی اور ان کی دنیاوی امیدوں کا بالکل خاتمہ ہوگیا۔ ان دو سانحوں کے بعد یہ ایسے برداشتہ خاطر اور تنگ دل ہوئے کہ تاج محل سے لکھنؤ جانے کی درخواست کی اور بہت اصرار کیا مگر انھوں نے کسی طرح اجازت نہ دی۔ درحقیقت ان کی شان بھی یہی تھی کہ ایسی حالت میں ان کو اجازت نہ دیتیں۔ چنانچہ ان کے اصرار اور مزید التفات سے یہ وہیں رہے۔ آخر میں نواب تاج محل صاحبہ نے اپنی دختر بیوہ (زوجۂ سید جعفر حسین) کا عقد ان کے ساتھ کردیا۔ تھوڑے ہی زمانہ کے بعد انھوں نے زوجہ کو ساتھ لے کر مکہ معظّمہ کا سفر کیا۔ اور واپسی کے وقت پہلے خود بیمار ہوئے اور جب نجف پہنچے تو ان کی زوجہ کا حمل ساقط ہوا۔ اسی صدمہ میں انھوں نے انتقال کیا۔ کل آٹھ مہینے دونوں کا ساتھ رہا چھ ماہ کے بعد جب ماہرؔ نے دوسرا عقد کیا اور لکھنؤ واپس آئے۔ نواب تاج محل کو کسی قدر اس واقعہ سے رنج پہنچا۔ مگر ان کے مصالح اس وقت اسی کے مقتضی تھے۔ لکھنؤ پہنچنے کے ایک سال بعد ان کے چچا مولوی کلب حسین صاحب (یہ وہ بزرگ ہیں جنھوں نے تاج محل سے عقد کرلیا تھا اور انھیں کے ساتھ کربلا میں رہتے تھے) نے انتقال کیا۔ جناب ماہرؔ اس زمانہ میں نہایت عسرت سے رہتے تھے۔ صرف تیس روپیہ ماہوار بطور پنشن ان کو ملتے تھے۔ اسی مقدار میں اپنی زندگی بسر کرتے تھے۔

مولوی کلب حسین کے انتقال کو ابھی چار برس نہ گذرے تھے کہ نواب تاج محل نے دنیا کو خیر باد کہا۔ خاندانی مجموعہ کا شیرازہ ابتر ہوگیا۔ ماہرؔ کو یہ خبر بذریعہ تار معلوم ہوئی۔ اسی وقت معہ اہل و عیال روانہ کربلا ہوئے۔ وہاں پہنچ کر انھوں نے اپنے حقوق حاصل کرنا چاہے مگر بڑی بڑی زحمتیں اٹھائیں۔ جیسی جیسی کوششیں کیں ان کو جاننے والے جانتے ہیں۔ نواب تاج محل کے مرتے ہی ان کی جائداد منقولہ وغیر منقولہ پر نواب اقبال الدولہ کا چوکی پہرا ہوگیا۔ جواہرات بیش بہا کے صندوقچے غائب کردیئے گئے۔ جو کچھ باقی رہ گیا اس پر تعلیقہ ہوگیا۔ مکانات و محل سرا پر زبردست پہرا زیادہ اس خیال سے تھا کہ سید مہدی حسین نہ آسکیں مگر انھوں نے بھی باوجود بے سروسامانی کے ایسی بلیغ کوششیں کیں کہ ان مکانات و محل سرا وغیرہ پر اپنا پورا قبضہ کرلیا۔ اب نواب عباس علی خاں عرف چھٹن صاحب (تاج محل کے بھائی) سے مقدمہ بازی شروع ہوئی۔ وہ ان کی بھتیجی (دختر سید جعفر حسین) کو ناجائز اور محروم الارث اولاد ثابت کرنا چاہتے تھے۔ مگر ان کی یہ سطحی کارروائیاں نہ چلیں اور ماہرؔ نے وراثت حقیقی ثابت کی اٹھارہ سال تک لندن، قسطنطنیہ، بمبئی، کلکتہ، لکھنؤ میں مقدمہ لڑتے رہے۔ نتیجہ میں کامیاب ہوئے اور فیصلہ انہیں کے موافق ہوا۔ دوران مقدمہ میں ایک مقدار کثیر کے قرض دار ہوگئے تھے۔ مالی معاملات کی نزاعیں دنیا میں ایک دوسرے فریق کو جانی دشمن بنادیتی ہیں۔ ماہرؔ مرحوم کو ایک مرتبہ زہر بھی دیا گیا اور کئی بار گولیاں ماری گئیں۔ مگر

ع "دشمن اگر قویست نگہباں قوی تر ست"

نواب میر اصغر حسین فاخرؔ کی شادی

دنیا کی یہ پرانی رفتار ہے کہ مال و زر کی طرف اہل دنیا کا میلان فطری ہوتا ہے۔ چنانچہ نواب تاج محل مرحومہ کی نواسی (دختر سید جعفر حسین) سے بہت بہت لوگوں کی خواہش تھی کہ شادی ہوجائے مگر ماہرؔ نے اس خیال سے کہ وہ لڑکی اب ان کے خاندانی سلسلہ میں داخل ہے مناسب سمجھا کہ اس کا عقد غفرانمآبؒ کی اولاد سے ہونا چاہئے۔ اس خیال سے فوراً بذریعہ

تار اپنے بھتیجے سید اصغر حسین کو لکھنؤ سے بلوا کر اس لڑکی کا عقد ان کے ساتھ کر دیا۔ اس معاملۂ خاص میں بھی ان کے خلاف بہت کچھ کوششیں کی گئیں مگر کارگر نہ ہوئیں۔ یہ صاحبزادی جن سے جناب فاخرؔ کا عقد ہوا ان کی حقیقی چچا زاد بہن ہیں۔

مقدمۂ خاص محل

آخر زمانہ میں نواب ننھے مرزا سے خاص محل کا مقدمہ مول لیا اور دس بارہ برس تک لڑتے رہے یہاں تک کہ لندن سے انہیں کے موافق فیصلہ ہوا اور پانچ لاکھ سینتیس ہزار کی ڈگری ہوئی۔ مگر روپیہ ابھی ملا نہیں۔ ان کے خصوصیات میں یہ بات قابل ذکر ہے کہ ان کے دل و دماغ کو مقدمات سے بہت زیادہ دلچسپی تھی اور قانونی باریکیوں پر ان کی نظر ویسی ہی حاوی تھی جیسے بیرسٹر اور وکلاء کی۔

شاعری

باوجود ان جھگڑوں کے شاعری نہ چھوٹی۔ دیکھو فطری شاعر کی یہی علامت ہے کہ اس کا دماغ کیسی ہی حالت میں ہو مگر اپنے ذوق سے فارغ نہ ہو۔ حضرت ماہرؔ منشی مظفر علی خاں صاحب اسیرؔ کے شاگردان خاص میں ایک ممتاز شاگرد تھے۔ اصناف سخن پر قدرت رکھتے تھے۔ ان کا دماغ خاص اسی کام کے لئے وضع ہوا تھا۔ جن لوگوں نے ان کے مرثیے یا اور کلام دیکھا ہے وہ میری تائید کریں گے۔

ماہرؔ کو لکھنؤ کے ٹکسال میں کاملان فن نے کامل العیار تسلیم کر لیا ہے۔ اساتذہ فن نے اپنی اپنی جگہ ان کو خلاق المضامین مان لیا ہے۔ ان کے دماغ میں جب کسی مضمون کی شاخ پیدا ہوتی تھی تو اس شاخ سے ہزاروں کوپلیں اور ہر کوپل سے سیکڑوں پھول نکلتے چلے آتے تھے۔ بیلوں کی طرح ان کے خیالات بلندی کی طرف مائل ہوتے جاتے تھے۔ سلسلہ کا ختم ہونا دشوار ہو جاتا تھا۔ آخر وہ اُکتا کر اسے چھوڑ دیتے تھے۔ اگر وہ چاہتے تو ایک مضمون کو مدتوں نظم کرتے چلے جاتے اور ہمیشہ نئے پہلو سے۔ جس طرح زبان کے سوتوں سے پانی ابلتا ہے یا پہاڑ سے آبشار کی روانی اسی طرح ان کے دماغ سے پے در پے مضامین پیدا ہوتے چلے جاتے تھے۔ میدان شاعری کے بڑے بڑے شہسواروں کے ساتھ ہم قدم رہتے تھے۔

فن شعر میں ان کی یادگار نواب میر اصغر حسین فاخرؔ تھے۔ سوا ان کے ماہرؔ نے کسی کے کلام پر اصلاح نہیں دی اور نہ وہ اسے اچھا مانتے تھے۔ ایک مرثیہ کے چند بندان کے اس خیال پر شاہد ہیں ؎

شاگردوں کی کثرت سے خودی ہوگئی برباد
آخر کو نہ اپنے ہی سخن کی رہی بنیاد
حد سے جو بڑھی حرص تو یہ بھی نہ رہا یاد
شاگرد وہ کم کرتے تھے جو لوگ تھے استاد
صد شکر کہ میں خانۂ برباد نہیں ہوں
استاد وہی ہیں تو میں استاد نہیں ہوں

فن مرثیہ گوئی کا ہے، آساں یہ نہیں ہے
مجموعۂ اوراق پریشاں یہ نہیں ہے
یہ نظم ہے، بازیچۂ طفلاں یہ نہیں ہے
مضمون لڑیں جس میں وہ میداں یہ نہیں ہے
یہ کون کہے جان مصیبت میں پڑے گی
مضمون لڑیں گے تو طبیعت نہ لڑے گی

سب کچھ کہیں بے سمجھے تو کھولیں نہ دہن کو
میراث سے کیا ربط ہے اشعار کے فن کو
دیں شرع میں بھی دخل جو بھولیں نہ چلن کو
ناداں ہیں جو میراث سمجھتے ہیں سخن کو
حیراں ہوں ہنر کو نہ کرامات کو پایا
میراث میں پایا ہے تو اس بات کو پایا

پھر لطف تو یہ ہے کہ ہے اس بات پہ اصرار
حالانکہ نہیں ارث سے کچھ فن کو سروکار
گر مان بھی لیں تو بھی ہے بیکار کی تکرار
اولاد جو حاجب ہے وہ محجوب، یہ حقدار

حیرت تو یہ ہے ذہن خداداد کے ہوتے
حقدار بنے جاتے ہیں اولاد کے ہوتے
گو جانب مضموں ابھی آیا میں نہیں ہوں
ہے کون نظر جس میں سمایا میں نہیں ہوں
سر پر جو نہیں سب کے وہ سایہ میں نہیں ہوں
شاگردوں کا استاد بنایا میں نہیں ہوں
دوں میں یہ جواب اب تو وہاں گنگ زباں ہو
شاگرد وہ میرا ہو جو استاد جہاں ہو
استاد جو کچھ کہہ دیں تو شاگرد ہوں دل شاد
مجلس میں وہ غل ہوں کہ کرے شور بھی فریاد
یہ اُن کو پڑھائیں وہ کریں ان کا سبق یاد
شاگرد کے شاگرد ہیں استاد کے استاد
وہ ان سے سوا اور نہ یہ کم دیتے ہیں اُن کو
جان ان پہ وہ دیتے ہیں یہ دم دیتے ہیں ان کو
آمد کے یہ معنی ہیں یہ آمد ہے سخن کی
تکیہ یہ زباں پر ہے، نہ مسند ہے سخن کی
رد اپنی کریں آپ عجب کد ہے سخن کی
آگے نہ بڑھے اس سے کہ جو حد ہے سخن کی
اور ایسی تعلی تو قیامت ہے ستم ہے
حد ہوگئی ہر مرثیہ گو خاکِ قدم ہے
اخبار سے ہو باخبری گر انہیں حاصل
تعمیم نہ ایسے ہو نہ یہ خاص ہو مشکل
بات ایسی کبھی منہ سے نکالیں گے نہ عاقل
معصوم بھی تو مرثیہ گویوں میں ہیں داخل
حد ہو گئی اس طرح سے مفہوم کو چھوڑا
نا اپنے بزرگوں کو نہ معصوم کو چھوڑا
سمجھے نہ کہ اس سے تو بلا آتی ہے سر پر
لوگوں کی طرح زلف بھی بل کھاتی ہے سر پر

ناگن انہی باتوں سے تو لہراتی ہے سر پر
جو خاک قدم ہے وہی تو جاتی ہے سر پر
گر موڑیئے اس بات کو تو یوں بھی مڑے گی
جائیں گے جدھر نظم میں واں خاک اڑے گی
بعد اس کے یہ فرماتے ہیں بے ساختہ پن میں
جز ان کے نہ ابھرا کوئی دریائے سخن میں
گو اپنی ثنا عیب نہیں نظم کے فن میں
وہ بات ہو لیکن جو سمائے بھی دہن میں
کہہ دے کوئی نقصاں ہے مباہات میں ان کا
منہ کھل کے نہ رہ جائے بڑی بات میں ان کا
آتی ہے یونہی طبع جدھر آتی ہے اکثر
یوں ہی سوئے دریا سوئے بر آتی ہے اکثر
میت بھی تو پانی پہ نظر آتی ہے اکثر
مٹی بھی تو دریا میں ابھر آتی ہے اکثر
دریا کے تموّج میں گذرتے نہیں دیکھا
حیران ہوں خس کو بھی ابھرتے نہیں دیکھا
یہ حالِ سخن ہے، یہ ٹھکانے کی زباں ہے
بگڑی ہوئی باتوں کے بنانے کی زباں ہے
فخر اس کا عبث ہے کہ گھرانے کی زباں ہے
میری وہ زباں ہے، جو زمانے کی زباں ہے
مجھ کو ہو تفاخر تو بجا بھی ہے بیاں میں
ہے لاکھ زبانوں کا مزہ ایک زباں میں

مجالس عزا کا شوق

مرحوم کی یہ صفت اور حسن عقیدت قابل الذکر ہے کہ مجلسوں سے ان کو ایک خاص انہماک واشتغال تھا۔ عشرۂ محرم میں جیسی مجلسیں حضرت ماہرؔ کے یہاں ہوتی ہیں بہت کم اس قدر اہتمام اور خوش سلیقگی سے کسی رئیس کے یہاں ہوتی ہیں۔ وہ اہل مجلس کی خاص طور سے خدمت کرتے تھے۔ ہر کہ ومہ سے ان کے اخلاق

بہت وسیع رہتے تھے۔ ذاکر جب منبر پر جاتا تھا تو بوجہ ثقل سماعت منبر کے قریب جا کر بیٹھتے تھے اور بہت زیادہ روتے تھے۔ ختم مجلس کے بعد میں نے خود دیکھا ہے کہ رونے والوں کے آنسو اپنے رومال میں پونچھتے تھے اور خود زار زار روتے جاتے تھے۔

اخلاق

مولوی مہدی حسین ماہرؔ تاج محل کے داماد تھے اور لکھنؤ کے ممتاز اہل دول میں ان کا شمار تھا مگر نشۂ دولت نے ان کو کبھی بے خود نہیں کیا۔ ان کے اخلاق کا رہین منت ناچیز عزیزؔ بھی ہے۔ ہر شخص سے نہایت خلوص اور انکسار سے ملتے تھے۔ باطن بھی ان کا ظاہر کی طرح صاف تھا۔ کبھی کبھی اپنے مرثیے سنانے کے واسطے ایک مخصوص صحبت کیا کرتے جس میں اس ناچیز کو بھی یاد کرتے رہے۔

آخری زمانہ

آخر عمر میں ثقل سماعت اور ضعف بصارت بہت ہو گیا تھا۔ دیکھنے سننے سے معذور تھے۔ سال میں چند مجلسیں کرتے تھے جس میں اپنے نئے مرثیے اپنے بڑے صاحبزادے سید نظیر حسین صاحب سے پڑھواتے تھے۔ میں نے ان مجلسوں میں اکثر دیکھا کہ نظیر حسین صاحب اگر مرثیہ پڑھتے پڑھتے کبھی رُکے یا کسی مصرع کے پڑھنے میں یا ادا کرنے میں کوئی سقم ہوا تو ماہرؔ مرحوم اٹھ کھڑے ہوتے تھے اور خود پڑھنے لگتے تھے۔ اس وقت ان کا جوش وخروش اور ان کا زور وشور دیکھنے کے قابل ہوتا تھا۔ سننے والوں پر ایک خاص کیفیت طاری ہوتی تھی کیونکہ دیکھنے سے معذور ہیں، مرثیے کو آنکھ سے ملا کے بہت دقت کے ساتھ کچھ حرف دکھائی دیتے تھے۔ تعریف کرنے والوں کی آواز سن نہیں سکتے تھے مگر اشاروں پر سلام کرتے جاتے تھے یا جب کوئی متنبہ کرتا تھا کہ فلاں شخص بہت تعریف کر رہا ہے تو اس کو خاص طور سے سلام کرتے اور شکریہ بجالاتے تھے۔ ہائے ان آنکھوں نے جو کچھ سماں دیکھا تھا وہ سب خواب پریشاں ثابت ہوا۔ ماہرؔ کہاں اور ان کی معجز بیانی کہاں۔ ۱۶/ماہ ربیع الثانی ۱۳۲۵ھ میں اس دنیا کو خیر باد کہا۔ یہاں پر مرحوم کا ایک شعر یاد آ گیا

ہم اپنی راہ آئے تھے جاتے ہیں اپنی راہ
دنیا رہے زمین رہے آسماں رہے

اپنے جد امجد غفران مآبؒ کے امام باڑہ میں صدر کے حجرے میں دفن کئے گئے۔ مرحوم کی مجلس چہلم میں ہیچمدان نے ایک مرثیہ عرض کیا تھا جو ہدیۂ ناظرین ہے۔

گرم کن ہنگامہ خیز اے نالۂ محشر طراز
تنگنائے عافیت را رستخیز اندازہ ساز
جامہ اندر نیل زن اے آسمان امروز باز
زلفِ شب آشفتہ شو اے در غمش عمرت دراز
وقف شو اے سیل خوناب جگر در ماتمش
دجلہ ریز اے سلسبیل چشم تر در ماتمش

آسمان اے رخنہ ہا انداز در کار عزیزؔ
چند گریانی مرا در فرقت یار عزیزؔ
رحم کن رحمے خدا را بر دل زار عزیزؔ
می نگر اکنون بسوئے چشم خونبار عزیزؔ
اشک خواہم ریختن لکن بعنوانے دگر
تا بجوشد ہمچو سیل نوح طوفانے دگر

خواہم امروز از تو اے دل ساز و سامان دگر
از بہار زخمہائے نو گلستان دگر
دہر برمن تنگ شد بنما بیابان دگر
چاک شد این پیرہن خواہم گریبان دگر
بخیہ گر تا چند می سازی رفو در پیرہن
چند بفریبی بنقش صبر اے غمخوار من

از رحیق خون دل لبریز شد مینائے من
قول عرفی تازہ کرد آہنگ غم پالائے من
صیحدم چون در دمد دل صور شیون زائے من
آسمان صحن قیامت گردد از غوغائے من
در دلم صد آہ دہر آہے بزعم خویشتن
میکند سامان بربادی پئے چرخ کہن

آه آن گردون که سامان نشاطم بر شکست
وز کشاکشهائے بیدادش دلم یکسر شکست
خار خارکاوش او در جگر نشتر شکست
مرغ عقل و هوش را اندر نشیمن پر شکست
حالیا عبرت بگیر از وضع دور آسمان
یکدمک هشیار شو اے مائل خواب گران

میدهد پیغام مرگ این آمد و رفت نفس
اے حریص زندگی الله و بس باقی ہوس
بر بساط عیش غفلت تا بکے اے نکتہ رس
کاروان رفت است بشنو نالہ بانگ جرس
راه تو دشوار افتادست و پر ہول و خطر
زاد عقبیٰ جمع کن بر گیر کالائے سفر

تا بکے گوئے سخن از حسرت عہد شباب
گوش کن اے بے خبر آواز عجّل فی الذہاب
چشم غفلت برکشا اے سرخوش صہبائے خواب
چون شنیدستی لدوا للموت و ابنوا للخراب
از حدوث دہر شو اندازه سنج روزگار
عبرتے بر گیر ازین دیر سپنج روزگار

بنگر از عبرت بسوے تربت ماہرؔ ببین
آنکہ بود از خامہ ابداع نقش اولین
در گروه ما وحیدالعصر مضمون آفرین
ہست آن گنجینہ فضل ومعانی در زمین
خون ببارد چشم ما در ماتم مہدی حسین
در جگر ناخن بیفشارد غم مہدی حسین

کشتی عمر روانش بر کنار افتاده است
آن دماغ عرش پیمائش زکار افتاده است
حیف در زیر زمین خورشیدوار افتاده است
پیکرش اینک باغوش مزار افتاده است
نقش شد تصویر او بر پرده پندارما
بر مزارش جبہہ ساید حسرت دیدارما

نظم او گوید بملک شعر فرمان منست
نام او سر دفتر افراد اعیان منست
سطر سطرے از کلام او رگ جان منست
از تصور صورت او در شبستان منست
شاعری نالد که ماہرؔ رخت عزم از دہر بست
حیف آن ساقی نماند و آه این ساغر شکست

از فروغ جلوه طبعش خجل شد انوریؔ
پیش او در مدح گوئے سرنگوں شد ظہیریؔ
چو نباشد نظم او را ہر سخنور مشتری
قدر گوہر شاه داند یا بداند جوہری
بنگر از انصاف ای منکر چوداری شک و ریب
میبود مضمون ہر یک بیت او مضمون غیب

با چنین اخلاق در دنیا توانگر دیدهٔ
یا بفن شعر معنایش سخنور دیدهٔ
یا چنین مداح اولاد پیمبرؐ دیدهٔ
فاش میگویم باین اوصاف کمتر دیدهٔ
می سزد نازد بر او گر دودمان اجتہاد
مادر گیتی نظیر وی درین عالم نزاد

پانزده بود از ربیع الآخر و یوم الخمیس
دامن خود برگرفت از دست دنیای خسیس
رفت و شد با سید شبان جنت ہم جلیس
ہم زبان روح القدس گردید و رضوانش انیس
یافت در جلدوے ہر بیت خودش کاشانۂ
شاہد قولم حدیث و نیست این افسانۂ

بر کنار بحر چون بردند نعش آنجناب
از لطافتہائے طبعش آب شد در اضطراب
زان سپس آن ذره مہر آشنائے بو ترابؑ
زیر خاک آسود در گورابۂ غفران مآبؒ
سال فوتش را بحسن تعمیه دادم نشان
داخل خلد بریں شد ماہرؔ معجز بیان
۵ ۲ ۳ ۱ ھ

اولاد

زوجۂ اولیٰ سے نواب سید نظیر حسین صاحب، نواب مولوی سید عابد حسین صاحب، زوجۂ سید محمد اصطفیٰ صاحب خورشید لکھنوی،[1] زوجۂ ثانی سے زوجۂ جناب چھنگا صاحب حسینؔ۔

مرثیہ گوئی

مولوی مہدی حسین ماہرؔ صاحب نے اپنی زندگی کا زیادہ حصہ مرثیہ گوئی میں صرف کیا۔ ان کے مراثی کا حصہ بہ نسبت غزلیات کے بہت زیادہ ہے۔ جس مرثیہ کو دیکھئے مضامین کا ایک دریا امڈا چلا آتا ہے۔ کہیں پر طبیعت نہیں رکتی۔ یہاں چند بند مختلف مرثیوں کے لکھے جاتے ہیں۔

مناظر

مرثیہ میں جہاں اور موضوعات ہیں وہاں ایک قدرتی مناظر کی مصوری بھی ہے جو اس کا قوی عنصر ہے اور قریب قریب سب کے مراثی میں ہے۔ اردو میں اس کی ابتداء جس طرح چاہئے تھی میر انیسؔ نے کی اور انھیں پر ختم ہوئی۔ مغربی شاعری کے پسند کرنے والے اسی سے انیسؔ کی شاعری کا کلمہ پڑھتے ہیں جو قدرت انھوں نے حاصل کی تھی وہ اردو میں پہلی مثال تھی۔ اس میں شک نہیں کہ ان کے قلم نے فوٹوگرافی کا کام دیا۔ اس وقت ان سے بحث نہیں ان کی شاعری کو مجھ سے بدرجہا بہتر معاصرین دکھا چکے ہیں۔ چونکہ مرثیہ کے ذکر میں میر انیسؔ کا نام آجانا فطرت میں داخل ہوگیا ہے اس لئے یہ چند سطریں قلم سے از خود نکل گئیں۔ ماہرؔ مرحوم کے مرثیوں میں بھی یہ جز ایک مہتم بالشان جز ہے۔ جہاں تک میں نے خیال کیا ان کو اس انداز سخن کی مصوری پر بہت اچھی دست گاہ تھی۔ بڑے زوردار مصرع نکالتے تھے اور بہت اچھی تصویریں کھینچتے تھے۔ یہاں پر مختلف مناظر کے چند بند لکھتا ہوں:

صبح کا منظر

حضرت قاسم کے حال کا مرثیہ ہے اور شادی کے حالات نظم کئے ہیں

یہ ذکر تھا کہ جہاں میں دم سحر آیا
برات لے کے ستاروں کی خود قمر آیا
اخیر رات میں معشوق سیمبر آیا
سحر کے ہوتے ہی دولہا دلھن کے گھر آیا
چلی نسیم کہ دل میں کٹاریاں اتریں
ستارے چرخ سے ٹوٹے سواریاں اتریں

نظر فلک پہ سحر کے جب انتظام آئے
شفق کا باغ کھِلا وقتِ دورِ جام آئے
زبان بلبلِ شیدا پہ گل کے نام آئے
نسیم آنے لگی وصل کے پیام آئے
نہ بلبلوں کو فقط لطف وصل ملتے تھے
پھرے جو دِن تو شجر کے بھی پھول کھلتے تھے

عروس صبح جو سلمائے بے حجاب ہوئی
شفق کے دور میں مست شراب ناب ہوئی
گلوں کے رخ پہ ہر اک پنکھڑی نقاب ہوئی
حیا یہ شرم سے سمٹی کہ آفتاب ہوئی
اداو ناز کے وقت آئے گھاتیں ہونے لگیں
ڈھکی ڈھکی گل و بلبل میں باتیں ہونے لگیں

صبح اور بہار

جب دکھائی سحر غم کی ضیا تاروں نے
پائی تخفیف سی کچھ درد میں بیماروں نے
کروٹیں فرش پہ لیں صبح کے بیداروں نے
آنکھیں کھلوا دیں ہر اک طیر کی چہکاروں نے
جان اس نیند پہ کس کس کو نہ دیتے دیکھا
کروٹیں سبزۂ صحرا کو بھی لیتے دیکھا

وہ فلک حسن کا دریا وہ کواکب کا عبور
صبح کا نور وہ کم کم وہ دھندلکا تا دور

[1] یہ بزرگ لکھنؤ کے مشاہیر شعراء میں تھے اور مسلم الثبوت استاد تھے۔ آئندہ ان کے حالات لکھوں گا۔ عزیزؔ

جب یہ تھا وقت یہ عالم یہ تجلی یہ نور
گردنیں پَر میں چھپائے ہوئے بیٹھے تھے طیور
جب نسیم آتی تھی سر سوئے فلک اٹھتے تھے
کوئی کونپل بھی جو ہلتی تھی چہک اٹھتے تھے

رخصت شب کے وہ آثار، سحر کا وہ ظہور
چھاؤں تاروں کی کہیں اور کہیں چھٹکا ہوا نور
وہ لہکتے ہوئے سبزے پہ ہواؤں کا مرور
کج کیے گردنیں تکتے تھے سوئے چرخ طیور
تھا یہ مطلب کہ یوں ہی سیر پُرافسوں دیکھیں
دشت اس آنکھ سے اس آنکھ سے گردوں دیکھیں

سبزۂ دشت سے وہ طائروں کے غول اٹھنا
وہ سر شاخ کسی طیر کا پَر تول اٹھنا
زمزموں کے لئے منقار کہیں کھول اٹھنا
ایک کا ایک کی آواز پہ وہ بول اٹھنا
یہ بھی ہوتا تھا کبھی نیند جو لے اُٹھتے تھے
اپنے نالوں کا جواب آپ ہی دے اٹھتے تھے

پہلوئے گُل میں وہ بلبل کا ترانہ ہر بار
باتوں باتوں میں وہ پھولوں کا ہنسانا ہر بار
وہ نشانوں کا سحر کے نظر آنا ہر بار
ٹوٹے تاروں کا وہ نزدیک سے جانا ہر بار
حسن تھا صبح میں بھی دلبر مہرو کی طرح
تارے ہاتھوں سے نکل جاتے تھے جگنو کی طرح

لہر سبزے کی وہ کوسوں وہ سحر نوارنی
فرش تھے مخمل ابریشمی وکاشانی
آب فوارہ نہ گرتا تھا دم طغیانی
تن کے خود دیکھتا تھا حسن کو اپنے پانی
آب نے کیسی دکھائی تھی روانی آخر
پھر گیا حسن پہ فواروں کے پانی آخر

سرخ وہ رنگ شفق وہ فلک زنگاری
طائروں کی وہ صدا نخل پہ باری باری
وہ ہر اک پھول پہ گلکاری ومیناکاری
دیکھتا تھا جنھیں تھم تھم کے خود آب جاری
کس کی اب عقل میں ہر گل کا قرینہ آئے
پائے فوارہ پہ جب سر کا پسینہ آئے

در شبنم کی وہ پیشانیٔ گل پر چھپکے
آنکھ نرگس کی بھلا دید میں کیوں کر جھپکے
ٹھنڈی ٹھنڈی وہ ہوا اور وہ بو کے بھبکے
اوس وہ کھائی تو کچھ اور بھی پودے پھبکے
صبح ہوتے ہی بنی عرش کے پائے کی طرح
کیا زمیں تھی کہ شجر بڑھتے تھے سائے کی طرح

صبح

(مرثیہ) سحر کے حسن پہ جب طرہ آفتاب ہوا [۱]

لگا کے ڈانڈ یہ کہتے تھے پانی پر ملاح
تجھی سے نور مسا ہے تجھی سے نور صباح
ترے ہی پاس ہے ہر باب بستہ کی مفتاح
تو ہی نے کشتیوں کو بحر میں کیا سیاح
پہنچ ہی جائے گا منزل پہ بار اپنا بھی
کرم ترا ہے تو بیڑا ہے پار اپنا بھی

وہ وقت صبح وہ دریا وہ کشتیوں کا تھماؤ
وہ ناخدا کا یہ کہنا یہی رہے برتاؤ
ولی ولی کا وہ غل وہ خلاصیوں کا جماؤ
علی علی وہی پھر ہاں نکل چلی ہے ناؤ
عیاں ہے سب پہ جو حیدر میں زور باری ہے
وہ در تھا کون سا جس پر سے فوج اتاری ہے

فوارہ

دلوں کو سیر سے فواروں کے نہ کیوں ہو سرور
انہیں سے الجھے نظر آتے تھے خطوطِ نور

---

[۱] امام حسنؑ کے حال کا مرثیہ ہے اس میں پانچ سو بند ہیں

بہارِ باغ میں اُڑ اُڑ کے جاتے تھے تا دور
نہال جان کے جب ان پہ بیٹھتے تھے طیور
مزہ تو یہ ہے کہ ہرموئے دل پہ درہ تھی
جو سیر آب میں تھی اس پہ بھی یہ طرہ تھی

میں کہہ چکا ہوں کہ مضمون آفرینی کے وقت ان کا سلسلۂ خیال لا متناہی ہو جاتا ہے۔ بہت سے بند فوارے کے متعلق مختلف مرثیوں میں ہیں جن کے بعض مصرع یہاں لکھتا ہوں:

یہ جس کی فکر تھی اس کا دماغ کیسا تھا[۱]
نہال آب تھی جس میں وہ باغ کیسا تھا
زمیں کو دھوتی تھی شبنم فلک کو فوارے
مرثیہ: ازل سے عقدزباں وسخن ہے عالم میں[۲]

تعریف آب

صفا سے ماہیوں کا موئے پر بھی آئے نظر
یہ کیا کہ جنبش قلب وجگر بھی آئے نظر
جگر پہ کیا ہے نفس کا اثر بھی آئے نظر
اثر پہ کیا ہے خود اپنی نظر بھی آئے نظر
کچھ اس طریق سے آنکھوں کو راہ ملتی تھی
جو شے تھی تہ پہ وہ نظروں کے ساتھ ہلتی تھی

لطیف وہ کہ جو ہمراہ آب و تاب بڑھے
بڑھے نگاہ تو موجوں کا پیچ وتاب بڑھے
ہلے اگر پر ماہی تو اضطراب بڑھے
چھلک پڑے جو ذرا موتیوں کی آب بڑھے
کمی کی شکل تھی وہ جس سے ہٹ گیا پانی
جب آئی آنکھوں میں خنکی تو گھٹ گیا پانی

یہ سب باعتبار مضمون قابل داد ہیں۔

گرمی

یہ حال جب ہو تپش کا تو اس کا کیا ہو حساب
گھرا تھا آب میں خود آفتاب عالم تاب
بنی تھی سوختہ ریشم ہر ایک موجِ آب
وہ دغ کے رہ گئی ماہی جو آئی زیر حباب
ثبوت کیوں نہ ہو دعویٰ کا اس گواہی پر
وہی ہیں داغ جو اب تک ہیں پشت ماہی پر

تپش سے غیر تھی حالت ہر اک حباب کی بھی
یہاں تلک کہ بھنور کی بھی موج آب کی بھی
شعاع مہر کی بھی نورِ ماہتاب کی بھی
زبان پیاس سے نکلی تھی آفتاب کی بھی
ہر ایک لہر سے تھا فرق شان نہر میں بھی
پڑے تھے پیاس سے کانٹے زبان نہر میں بھی

سیاہ جل کے جو رنگت تھی ہر سحاب کی بھی
رکی تھی سانس ہوا کی بھی ہر حباب کی بھی
زبان پیاس سے اینٹھی تھی موج آب کی بھی
لگی تھی جان تری سے خود آفتاب کی بھی
مزاج حار تو کچھ اور بھی عذاب میں تھے
فلک پہ مہر تھا پائے شعاع آب میں تھے

وہ دشت اور وہ گردوں کی آتش افشانی
فرات تھی کہ زمیں کے عرق کی طغیانی
ہرے تھے نخل نہ سبزے کا رنگ تھا دھانی
جبھی کی دھوپ سے تیغوں کا خشک ہے پانی
ثمر جو نخل میں ہے وہ گل فسردہ ہے
جبھی سے ماہیٔ جوہر ہر ایک مردہ ہے

تپش وہ آئی جو تھی امتحان تیغ میں بھی
لگی تھی جوہروں سے آگ جانِ تیغ میں بھی
نہ جوہروں سے ہو کیوں فرق شان تیغ میں بھی
پڑے تھے پیاس سے کانٹے زبان تیغ میں بھی
مِلا بھی آب تو وہ جس سے دل ٹھہر نہ سکا
جو حلقِ خشک میں قبضوں کے بھی اُتر نہ سکا



[۱] امام حسنؑ کے حال کا مرثیہ ہے۔ اس میں ۵۰۰ بند ہیں [۲] حضرت قاسم کے حال کا مرثیہ ہے۔ ۵۰۰ بند ہیں